ڈاکٹر وزیر آغا

غزل اور اکیسویں صدی

اکیسویں صدی میں ان اصناف ادب کے فروغ پانے کے امکانات نسبتاً زیادہ ہوں گے جن میں اختصار کا دامن وسیع اور داخلی ربط کا نظام ڈھیلا ڈھالا ہوگا۔ اصناف ادب میں یہ دونوں اوصاف غزل اور انشائیے میں موجود ہیں۔ دونوں اصناف کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور دونوں کے اندر بنت کاری گنجان نہیں ہے۔ مراد یہ کہ دونوں اپنے اندر جا بہ جا روزن اور شگاف رکھتی ہیں۔ بھاری طلائی چادر اور جالی دار دوپٹے میں جو فرق ہے وہ ان دونوں اصناف کو دیگر بہت سی اصناف ادب سے جدا کرتا ہے۔ چوں کہ اس بات کا امکان ہے کہ اکیسویں صدی بھی اس وضع کے اوصاف کی حامل ہوگی اس لیے اگر یہ دونوں اصناف اکیسویں صدی میں فروغ پائیں تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہوگی۔

اکیسویں صدی سے آشنا ہونے کے لیے بیسویں صدی کے ربع آخر میں نمودار ہونے والی تبدیلیوں کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کیوں کہ ان ہی تبدیلیوں سے آئندہ صدی کے خدوخال مرتب ہوں گے۔ ان میں ایک اہم تبدیلی یہ ہے کہ سلطنتیں ایک بڑی حد تک ختم ہوگئی ہیں اور ان کی جگہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی حلقے وجود میں آنے لگے ہیں۔ مثلاً برطانوی سلطنت، اس کے بعد روس کی سلطنت، پھر جاپان اور جرمنی کی سلطنتیں باقی نہیں رہیں۔ ان کی جگہ ''حلقوں'' نے لے لی ہے یعنی سلطنت کی اکائی شکست آشنا ہو کر دوبارہ ایک نئی ترتیب اختیار کرنے لگی ہے۔ مثلاً یورپ کے ممالک اپنی اپنی جگہ قائم ہیں تاہم جڑ کر ایک کامن مارکیٹ بننے لگے ہیں۔ یہی حال روس کا ہے یونیسکو، ورلڈ بینک اور یو این او۔ یہ سب ادارے ایک عالمی ترتیب نو کو وجود میں لا رہے ہیں۔ پوری دنیا قوموں کی سطح سے اوپر اٹھ کر تہذیبوں کی صورت میں اپنا جلوہ دکھانے لگی ہے۔ ان جملہ ''حلقوں'' میں جزو اور کل کا رشتہ وہی ہے جو غزل کے شعر کا پوری غزل سے ہوتا ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ آزاد ہے۔ مگر ردیف اور قافیہ کی ڈور میں پرویا ہوا بھی ہے۔ لہٰذا اس کی حیثیت غزل کے ایک انگ کی ہے۔ اسی طرح پوری دنیا ایک ایسی اکائی میں تبدیل ہو رہی ہے جو بالآخر بہت سی اکائیوں کا ایک جالی دار مرکب قرار پائے گی۔ ایسے

Scanned by CamScanner

منظر نامے میں غزل ایسی شعری صنف کے مقبول ہونے کے امکانات کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

انیسویں صدی کا علامتی مظہر سٹیم انجن تھا جس میں قوت مرتکز تھی۔ یہ ایک طرح کا ''سپر مین تھا'' جو ہر طرف دندناتا پھرتا تھا۔ مگر بیسویں صدی کے آخری ایام تک آتے آتے کمپیوٹر غالب آنے لگا ہے جو قوت کو ایک جگہ مرتکز کرنے کے بجائے اسے رشتوں کے ایک جال کی صورت میں دیکھنے پر مائل ہے۔ بیسویں صدی کے تمام فکری دبستانوں میں ارتکاز کے بجائے ہم رشتگی کا تصور مضبوط بنیادوں پر استوار نظر آتا ہے۔ یہی وہ پیٹرن ہے جو غزل کو ہمیشہ سے پسند رہا ہے۔ غزل میں بھی مختلف اشعار مل کر ایک رشتہ بناتے ہیں۔ جس سے غزل کا مجموعی تاثر مرتب ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل کا کوئی نہ کوئی شعر مطلق العنانی کا اعلان کر کے اپنی زندگی آپ جینے لگتا ہے۔ مگر ایک تو یہ بات عام نہیں ہے (اڑنے والے اشعار تعداد میں بہت کم ہیں حتیٰ کہ بڑے سے بڑے غزل گو شاعر کے ہاں بھی محض چند اڑنے والے اشعار ہی جنم لیتے ہیں) دوسرے جب شعر غزل سے جدا ہوتا ہے تو غزل کے پراسرار ہالے سے باہر نکل جانے کے باعث اسے کسی نہ کسی حد تک نقصان بھی پہنچتا ہے اس سلسلے میں یہ تجربہ عام ہے کہ غزل کے شعر کو اگر غزل کے مطلع کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس کا تاثر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں پوری غزل کی خوش بو رفتار بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ خود غزل کا مطلع بھی جس میں قافیہ ردیف کا دوہرا التزام موجود ہے نسبتاً زیادہ متاثر کرتا ہے۔

اکیسویں صدی کی ایک اہم شناخت Virtual Reality کی نمود ہوگی جو کمپیوٹر اور ٹیلی ویژن کے اشتراک سے ابھرے گی۔ گویا ایک دنیا کے متوازی ایک اور دنیا وجود میں آ جائے گی۔ مگر غزل میں تو ہمیشہ سے ایک طرح کی Virtual Reality موجود رہی ہے۔ غزل ہیئت کے اعتبار ہی سے دو لخت نہیں، معنویت کے اعتبار سے بھی دو لخت ہے۔ مگر اس کے دونوں حصے آپس میں اس درجہ مربوط ہیں کہ اگر ایک کو منہا کر دیا جائے تو دوسرا قطعاً بے اثر ہو جائے۔ دراصل غزل کے ہر شعر میں ایک معنوی پرچھائیں بھی ابھرتی ہے۔ جس شعر میں یہ معنوی پرچھائیں نمودار نہ ہو وہ محض ایک ''بیان'' بن کر رہ جاتا ہے۔ ایک ایسی صدی جو ہیئت اور مزاج کے اعتبار سے جڑواں حقیقتوں کی مظہر ہوگی۔ ایک ایسی شعری صنف کو ضرور قبول کرے گی جو مزاجاً جڑواں ہے یعنی دو مصرعوں کو باہم مربوط نہیں کرتی بلکہ دو دنیاؤں کا بھی سنگم ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس بات کے امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ اکیسویں صدی میں تجسیم اور تجرید کا ایک انوکھا امتزاج رونما ہوگا۔ یعنی سامنے کی ٹھوس حقیقت کے عقب میں تجرید کی کارفرمائی

Scanned by CamScanner

صاف دکھائی دینے لگے گی۔ ٹیلی ویژن کے فروغ اور کمپیوٹر کے بڑے پیمانے پر استعمال کے باعث ہم دو دنیاؤں کے باسی قرار پائیں گے۔ ایک دنیا جسے ہم چھو اور سونگھ بھی سکتے ہیں اور دوسری دنیا جسے ہم صرف دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ تجسیم میں لامسہ اور شامہ کی کارکردگی زیادہ ہوتی ہے جب کہ تجرید میں باصرہ اور سامعہ کی! اکیسویں صدی تجسیم اور تجرید کو جوڑ کر آگاہی کی طرف ایک واضح قدم اٹھائے گی۔ چوں کہ غزل ہیئت کے اعتبار سے جڑواں نہیں بلکہ تجسیم اور تجرید کے منطقوں کو بھی جڑواں بنانے پر قادر ہے۔ اس لیے آئندہ صدی میں اس کے فروغ پانے کے امکانات بھی زیادہ ہوں گے۔ واضح رہے کہ یہاں میرا اشارہ اس نئی غزل کی طرف ہے جو پٹے ہوئے کلیشہ زدہ شعر کی جکڑ سے آزاد ہوگی۔

محض بیان کرنا یا منعکس کرنا شاعری کا وصف نہیں ہے۔ آنکھوں دیکھا حال شاعری کی بہ نسبت، نثر میں بہتر طریق سے بیان ہوسکتا۔ منعکس کرنے کے لیے بھی کیمرہ زیادہ کارآمد ہے۔ دوسری طرف شاعری میں اشیاء اور مظاہر کی صورت میں تبدیلی ہوجاتی ہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ ان کی قلب ماہیت ہوجاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شاعری سامنے کی اشیا کو مادی آنکھ سے نہیں دیکھتی بلکہ باطن کی آنکھ کو بروئے کار لاتی ہے۔ خارج ہمہ وقت انسانی حسیات کی کارفرمائی کے باعث ہمارے اندر اترتا رہتا ہے مگر ساتھ ہی منتا بھی چلا جاتا ہے۔ اس کے صرف وہی حصے باقی رہتے ہیں جن کے ساتھ کوئی گہرا جذباتی تجربہ منسلک ہوتا ہے انھیں SIGNIFICANT IMAGE کہہ لیجیے۔ یہ اہم تصورات ٹکڑوں اور قاشوں (FRAGMENTS) کی صورت سائکی کی بعید ترین تہوں تک اتر جاتے ہیں اور صرف اس وقت متحرک ہوتے ہیں جب تخلیق کار کسی جذباتی بحران میں مبتلا ہوتا ہے تب یہ ٹکڑے پہلے تو نراج یعنی CHAOS منظر دکھاتے ہیں۔ مگر پھر تخلیقی عمل کے تحت آپس میں جڑ کر نئی نئی صورتیں اختیار کرنے لگتے ہیں۔ اور آخر میں یہ صورتیں اچانک ایک ایسا نامیاتی کل بناتی ہیں جس سے معانی کی کرنیں پھوٹ رہی ہوتی ہیں۔ لہٰذا تخلیق خارج اور اس کے مظاہر سے جڑی تو ہوتی ہے مگر اس کو بیان یا منعکس کرنے پر مامور نہیں ہوتی وہ گویا خارج کو از سر نو تخلیق کرتی ہے۔ اس جملہ معترضہ کی ضرورت مجھے صرف اس لیے پڑی ہے کہ ادب کی کارکردگی کے بارے میں بعض ایسے مفروضے رائج ہیں جو ''سوالات'' میں ڈھل کر ادب کی کارکردگی کو غلط سمت میں لے جاتے ہیں۔ وہ ادب کو بعض معاشی اور معاشرتی مقتضیات کے تابع کر کے اس کے فطری عمل پر پردہ ڈال دیتے ہیں مثلاً اس قسم کا مفروضہ کہ ادب کا کام معاشرتی اور تہذیبی سطح کے مسائل کو نشان زد کرنا انھیں حل کرنے کے لیے تجاویز پیش کرنا ہے وغیرہ! حالاں کہ ادب کا یہ کام ہرگز نہیں ہے۔ ادب تو انسان کے اندر

Scanned by CamScanner

SPACE یا کشادگی پیدا کرتا ہے اور انسان کے وژن کو وسعت عطا کرتا ہے۔ یوں دیکھیے تو ادب حکیم کا نسخہ یا سرجن کا نشتر نہیں ہے بلکہ یہ وہ عمل ہے جس سے CELL کے اندر تبدیلی رونما ہوتی ہے یعنی انسان کے متشدد میلانات کی تہذیب ہو جاتی ہے۔ یہ عمل ان تخلیقات کی صورت میں سامنے آتا ہے جو قاری کے اندر کی نفسیاتی سلوٹوں کو ہموار کر کے اسے ایک بہتر شہری بنانے میں مدد ثابت ہوتی ہیں۔

ادب کے اس منصب اور طریق کار کو ملحوظ رکھیں تو یہ سوال کہ کیا غزل ہمارے عہد کی زندگی کو پوری طرح بیان کرنے میں کامیاب ہے' کچھ مناسب نظر نہیں آتا۔ اول تو ''پوری طرح'' کے الفاظ ہی موزوں نہیں ہیں کیوں کہ کسی بھی عہد کو پوری طرح بیان کرنا اصناف شعر تو ایک طرف نثر کے بس کا روگ بھی نہیں ہے۔ دوسرے جیسا کہ اوپر کہا گیا محض ''بیان کرنا'' شاعری کا منصب بھی نہیں ہے۔ بے شک شاعری کا کنکریٹ CONCRETE یا ٹھوس سے ہم رشتہ ہونا ضروری ہے تا کہ وہ محض ہوا میں معلق ہو کر نہ رہ جائے مگر کنکریٹ یعنی ٹھوس کو آفاقیت UNIVERSALITY کے مقام پر لانا بھی اس کے لیے بہت ضروری ہے ورنہ وہ محض ''بیانیہ'' کی سطح پر رکی رہے گی۔ مگر یہ کام جب ہی ممکن ہے کہ کنکریٹ یا ٹھوس پہلے انسانی تجربات سے منسلک ہو کر تخلیق کار کے باطن میں اترے اور وہاں اپنی صورت بدل کر یعنی آفاقیت سے مملو ہو کر باہر آئے۔ غزل کا شاعر تخلیق کاری کے لمحات میں پوری کائنات سے جڑا تو ہوتا ہے مگر وہ اسے براہِ راست دیکھ کر بیان نہیں کر رہا ہوتا بلکہ اس کائنات کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو لاکھوں برس سے اس کے اندر اترتی رہی ہے۔ ساحر لدھیانوی نے کہا تھا؛

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

گو اس شعر میں بات صرف سطح کی بیان ہوئی ہے مگر اس میں تخلیق کار کی سمت کا صحیح ادراک یقیناً موجود ہے۔ شاعر کا کام محض لوٹانا نہیں جیسا کہ آئینہ صورتوں کو لوٹاتا ہے بلکہ حوادث یعنی تجربات سے مملو تصورات کو اندر کی کٹھالی میں ڈال کر ایک ''نئی صورت'' میں ڈھالنا ہے اور اس نئی ''صورت'' کو بصورت تخلیق دوبارہ زمانے کے سامنے لے آنا ہے۔ غزل میں ٹھوس کو آفاقی سطح تفویض کرنے کا عمل ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ لہٰذا وہ تاریخ اور قبل تاریخ کے ادوار کے علاوہ اپنے عہد کی روح کو بھی مس کرنے پر قادر ہوتی ہے مگر وہ یہ کام تخلیقی عمل کی مدد سے انجام دیتی ہے نہ کہ تجرباتی یا بیانیہ انداز کی مدد سے۔

کلاسیکی غزل کا رچاؤ' نغمگی اور لطف بیان۔۔۔ یہ سب کچھ اس کا اپنا تھا یعنی اس پر کلاسیکیت کی چھاپ موجود تھی۔ دوسری طرف نئی غزل کا رچاؤ' نغمگی اور لطف بیان اس کا اپنا ہے جس پر کلاسیکیت

Scanned by CamScanner

کے بجائے نئے زمانے کے دستخط ہیں۔ یہ کہنا کہ کلاسیکیت کی چھاپ سے منحرف ہو کر نئی غزل 'رچاؤ' نغمگی اور لطف بیان سے عاری ہوگئی ہے' صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بعض محترم غزل گو شعراء جو کلاسیکی غزل کے رچاؤ' نغمگی اور لطف بیان کو تبرکات کی طرح سینے سے لگائے پھرتے ہیں' دراصل کلیشوں کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ ہر زمانے کا اپنا رچاؤ' نغمگی اور لطف بیان ہوتا ہے جو اس کی تخلیقات میں ایک برقی رو کی طرح دوڑ رہا ہوتا ہے مگر جب زمانہ گزر جاتا ہے تو آنے والے زمانے کا رچاؤ' نغمگی اور لطف بیان اس کی جگہ لے لیتا ہے جو شاعر نئے زمانے سے منسلک ہوتے ہیں وہ اس کے رچاؤ' نغمگی اور لہجے کو نہ صرف پہچان لیتے ہیں بلکہ انھیں اپنا تجربہ بھی بنا لیتے ہیں مگر وہ شاعر جو صرف کلاسیکی عہد سے خود کو منسلک رکھنا چاہتے ہیں نئے عہد میں اجنبی نظر آتے ہیں۔ تخلیق کار کا کام اپنے عہد سے ہم آہنگ رہنا تو ہے مگر ساتھ ہی اپنے ماضی سے ہم رشتہ ہونا بھی اس کا کام ہے۔ کوئی بھی تجربہ روایت سے منقطع ہو کر کامیاب نہیں ہوسکتا اور کوئی بھی روایت تجربے سے منقطع ہو کر تخلیقی سطح پر برقرار نہیں رہ سکتی۔ نئی غزل نے کلاسیکی غزل کی ''روح'' سے انحراف نہیں کیا۔ کیوں کہ یہ روح تمام زمانوں کے جوہر کو خود میں سموئے ہوئے ہے۔ مگر اس نے کلاسیکی غزل کے مخصوص رچاؤ' نغمگی اور لطف بیان سے ہٹ کر اپنے زمانے کے لہجے میں بات کی ہے مثلاً نئی غزل اب آرائشی نہیں رہی۔ کلاسیکی غزل دربار سے منسلک تھی اور درباری آداب کے تابع تھی جہاں زیادہ الفاظ میں کم بات کہنے کا رواج تھا اس کے علاوہ وہ طوائف کے کوٹھے سے بھی منسلک تھی جہاں تصنع کی فراوانی تھی۔ علاوہ ازیں کلاسیکی غزل کی نغمگی میں بھی ایک ٹھہراؤ تھا جو ایک ٹھہرے ہوئے معاشرے کی دین تھا۔ دوسری طرف نئی غزل' جمہوریت اور سوشلزم کی فضا میں پروان چڑھی ہے جہاں قوت ایک جگہ مرتکز ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے پیکنوں میں تقسیم ہوگئی ہے لہٰذا اس کا تخاطب بھی ایک خاص نقطے (بادشاہ' طوائف' محبوب) کے بجائے ایک پھیلی ہوئی فضا کی طرف نسبتاً زیادہ ہے۔ ایک طرح کی INTER TEXTUALITY وجود میں آرہی ہے جس میں خطوط کسی ایک مقام پر مرتکز نہیں ہو رہے بلکہ ایک جال کی صورت میں پھیل رہے ہیں۔ نئی غزل کے لہجے میں بھی تبدیلی آئی ہے اس کا لطفِ بیان آرائش کی طرف کم اور سادگی کی طرف زیادہ مائل ہے۔ اس کی رفتار بھی مختلف ہوگئی ہے۔ اب وہ ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ میں باندھنے کے بجائے تہہ در تہہ رنگوں (معانی) کی حامل کیفیت کو محض چند رنگوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک خاص وضع کا تہذیبی رچاؤ جو کلاسیکی غزل کو مرغوب تھا' اب باقی نہیں رہا۔ اس کے بجائے مختلف خطوط یا ٹکڑوں یعنی

Scanned by CamScanner

FRAGMENTS کے انسلاک کی ایک صورت پیدا ہو رہی ہے جو سٹیج پر ہونے والے ڈراما کے تسلسل کے بجائے فلم کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظر کے عدم تسلسل یا DISCONTINUITY میں ظاہر ہو رہی ہے۔ لہٰذا رچاؤ کی نوعیت میں بھی فرق آ گیا ہے۔

ہر زمانے کا ایک اپنا ڈسپلن، لہجہ، تہذیبی رچاؤ اور آہنگ ہوتا ہے۔ جو لوگ اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جڑ جاتے ہیں اور نئے زمانے کے قدموں کی چاپ کو نہیں پہنچانتے ہم انھیں FOSSILS کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہر تخلیق کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربات کو بہ روئے کار لائے، محض اکتسابی رویے کو اپنانے تک محدود نہ رہے۔ ساتھ ہی ہر تخلیق کار جب تک اپنے اندر کے نسلی اور آرکی ٹائپس تجربات کے سلسلوں کو برانگیخت نہیں ہونے دے گا اس کا تخلیق کردہ ادب بھی محض عصری صورت حال تک ہی محدود رہے گا۔ کلاسیکی غزل کے مقلدین نہ صرف ''نئے زمانے کے تجربات'' سے کٹے ہوئے ہیں بلکہ اپنے اندر کی بعید ترین تہوں میں موجود ''انسانی تجربات'' سے بھی ہم رشتہ نہیں ہیں۔ وہی تخلیق زندہ رہتی ہے جو فرد کے تجربے کو انسان کے تجربے کی سطح تک لے آتی ہے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ وہ انسانی تجربات کی میراث سے ہم رشتہ ہو۔

مختصراً یہ کہ اعلیٰ شاعری انسان کے نسلی تجربات اور عصر سے حاصل کردہ تجربات سے مل کر وجود میں آتی ہے۔ مگر یہ ملاپ انضمام کی صورت میں نہیں بلکہ قلب ماہیت کی صورت میں ہوگا تو بات بنے گی یعنی جب فرد کا تجربہ نسل کے تجربات سے مس ہو کر آفاقی بن جائے گا وہی ''ٹھوس'' کو UNIVERSALIZE کرنے کی بات جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔

آخری بات یہ کہ آج وہی کلاسیکی غزل زندہ ہے جس میں شاعر کے انفرادی تجربات انسانی تجربات میں ڈھل گئے تھے اور وہ غزل جو محض کلاسیکی دور کے رچاؤ، نغمگی اور لطف بیان سے عبارت تھی اس کی حیثیت محض تاریخی ہے یا اسے زیادہ سے زیادہ آپ تبرک کہہ سکتے ہیں یہی حال نئی غزل کا بھی ہوگا اس میں بھی مآلِ کار وہی اشعار زندہ رہیں گے جو داخلی عصری تجربات کو انسانی تجربات میں مبدّل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ محض جدید انداز اور لہجے کو اپنا لینا کافی نہ ہوگا۔

Scanned by CamScanner